اُردو ادب اِس سہ ماہی میں

از

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

اُردو ادب کی اِس سہ ماہی میں ایک قابل ذکر کتاب "تنقیدی سرمایہ" ہے۔ اس کے لکھنے والے پرنسپل عبدالشکور ہیں۔ یہ کتاب دراصل ۱۹۴۶ء میں ایک مختصر مقالہ کے طور پر لکھی گئی تھی۔ لیکن شوق کی بے پایانی سے پوری ایک کتاب بن گئی۔ یہ اس کا دوسرا اڈیشن ہے۔ اور ترتیب کے اعتبار سے "نقشِ اول" سے بالکل مختلف ہے۔ اب اس کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یہ پہلا حصّہ ہے۔ جو میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں دوسرا حصّہ ترقی پسند نقادوں کے لئے وقف ہوگا۔ لیکن وہ ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔

اردو تنقید کے متعلق پروفیسر کلیم الدین احمد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اُردو میں تنقید کا وجود فرضی ہے۔ یہ تنقید کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر۔

صنم سنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے — کہاں ہے۔ کس طرف کو ہے کدھر ہے

جغرافیہ وجود سارا — ہر چند کہ ہم نے چھان مارا

کی سیر بھی گرچہ بحر و بر کی — لیکن نہ خیر ملی کمر کی

اس طرح نگاہ جستجو جغرافیہ اردو کی سیر کر کے مایوس واپس آجاتی ہے۔ لیکن تنقید کے جلوے سے مسرور نہیں ہوتی "

اس رائے میں سچائی نہیں ہے۔ محض طعن اور تشنیع ہے اور زیر بحث "تنقیدی سرمایہ" کی دو جلدیں اس رائے کو غلط ثابت کرنے میں بڑی شہادت کا کام دے سکتی ہیں اگر اردو کے قدیم تذکروں کو غور سے دیکھا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ اُس وقت بھی

اردو ادب کے ساتھ ساتھ تنقید کے سانچے موجود تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ تخلیقی قوت بغیر تنقیدی قوت کے ممکن ہی نہیں ہے۔ تنقید کا ادب سے وہی تعلق ہے۔ جو کہ ادب کا زندگی سے ہے۔ یہ فلسفہ بھی ہے اور مذاق علمی کی تاریخ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح ہماری شاعری ایک زمانہ تک مقررہ روش پر چلتی رہی۔ اور چند بندھے ٹکے مضامین نظم کرنے کا نام شاعری ہو کر رہ گیا۔ اسی طرح تنقید پر بھی جمود طاری رہا۔ اور وہ بھی تعمیری تخلیقی نہیں بلکہ رسمی اور میکانکی ہو کر رہ گئی۔ عذر کے بعد شاعری اور تنقید کو نئے محرکات حاصل ہوئے اور دونوں نے حیات اور کائنات کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ شکور صاحب نے جو ابواب قائم کئے ہیں ان کی گفتگو کے وسیع دائرہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کتاب کی تقسیم اس طرح ہے

(۱) تنقید کیا ہے ؟

(۲) ہمارا قدیم تنقیدی سرمایہ۔

(۳) اردو میں تنقید کی ابتدا۔

(۴) اردو تنقید کا عارضی زوال۔

(۵-۶) اردو تنقید کی ترقی کا پہلا دور۔ دوسرا دور۔

(۷) اس سرمایہ پر ایک نظر۔

شکور صاحب نے تنقید کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غالب نے تقریر کی لذت ان الفاظ میں بیان کی ہے :۔

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔"

"اس تقریر کی لذت کو اجاگر کرنا نقاد کا کام ہے۔ اس تقریر کی لذت میں زبان کی چاشنی اور جذبے کے حلاوت دونوں موجود ہوتی ہیں۔ چنانچہ جذبہ شاعر نہیں ہوتا۔ بلکہ شاعری کا موجب ہوتا ہے۔ مگر جذبے کا ہر بیان شاعری نہیں ہے۔ اس بیان کا خوبصورت دلکش اور دل نشین ہونا از بس ضروری ہے۔ اس طرح نقاد جس طرح جذبے کی جانچ پڑتال کرتا ہے

اُسی طرح زبان اور محاوروں کو بھی جانچتا ہے۔"

یہ تعریف ادھوری ہے۔ اب تنقید ایک سماجی عمل ہے۔ اس کے ڈانڈے تاریخ سے ملے ہوئے ہیں۔ وہ فن اور علم ہی نہیں۔ ایک ادارہ ہے اور اس کی تزئین و آرائش میں وہ تمام سماجی اور سائنسی علوم مدد دیتے ہیں۔ جن کو کہ ہم ادب سے دور رکھنے کے عادی ہیں۔

شکور صاحب نے میرؔ کے تذکرہ "نکات الشعرا" کے متعلق لکھا ہے "کہ اس میں تنقیدی مواد بہت کم ہے۔ اور جو کچھ ہے وہ محض برسبیل تذکرہ ہے۔" یہ وہی رائے ہے جو اس سے قبل میرؔ کے مخالفین یعنی حکیم قدرت اللہ قاسم۔ شفیقؔ اورنگ آبادی۔ اور مولوی کریم الدین وغیرہ نے ظاہر کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ اندھی اور بہری عقیدت جو قدیم مشرقی اخلاق کا ایک جزو ہے۔ میرؔ صاحب کے تذکرہ میں موجود نہیں ہے۔ اس میں توقع کے خلاف کافی تنقیدی مواد موجود ہے۔ اور اُنہوں نے زمانے کی عام اور غلط رائے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس قدر "برہنہ" اور "واشگاف" رائیں ظاہر کی ہیں۔ کہ ایک عالم میں تہلکا مچ گیا۔ ان کی خوبینی مُسلّم۔ لیکن ان کی اصابت رائے اور ان کی دیدہ وری میں شبہ نہیں

شکور صاحب نے اپنی کتاب میں وحید الدین سلیم کو کوئی جگہ نہیں دی۔ اور یہ بہت بڑی فرد و گذاشت ہے۔ انہوں نے فراق اور اعجاز حسین کا ذکر ترقی پسند حضرات کے گروہ میں نہیں کیا۔ حالاں کہ یہ دونوں حضرات ترقی پسندی کے دعویدار رہیں۔ اگر وہ کسی وجہ سے ان لوگوں کو اس زمرہ میں شامل کرنا نہیں چاہتے۔ تو اس کے اسباب و وجوہ پیش کرنے ضروری تھے۔ اس کتاب سے تنقید کے عہد بہ عہد رجحانات کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن یہ باتیں جو میں نے عرض کی ہیں۔ ان کی حیثیت خالِ رخِ زیبا کی ہے۔ ساری کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ اس میں حدیث دلبراں کا سا لطف ہے۔ آپ شکور صاحب کی رائے سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان کے خلوص پر شبہ نہیں کر سکتے۔

اردو کے بہت سے شاعر گم نامی کی حالت میں ہیں۔ بعض کی چند چیزیں منظر عام پر

آئی ہیں ۔ لیکن ان کے متعلق پوری تحقیق نہیں ہوئی ۔ ضرورت ہے کہ ان اساتذۂ سخن کا صحیح درجہ متعین کیا جائے ۔ اور ان کو ان کے درجہ کے مطابق اعزاز کی کرسیوں پر بٹھایا جائے ۔ اسی قسم کی ایک کوشش پرنسپل عبدالشکور نے نظام رام پوری لکھ کر کی ہے یہ نظام وہی ہیں ۔ جن کی یہ غزل "اٹھا کے ہاتھ" اور "مسکرا کے ہاتھ" بہت مشہور ہے ۔ ان کی شہرت کا انحصار ان کی غزلوں پر ہے ۔ قصیدوں میں نہ بلند آہنگی ہے اور نہ شوکت الفاظ لیکن غزلوں میں سادگی اور پُرکاری ہے شکور صاحب نے ۱۶ صفحات میں نظام کے تغزل سے بحث کی ہے اور ۳۲ صفحات میں ان کی غزلوں کا انتخاب پیش کیا ہے ۔

اگست ۱۹۴۲ء میں حضرت نیاز فتحپوری نے نظام پر ایک مقالہ لکھا تھا ۔ اس کے بعد نظام کے متعلق شکور صاحب کی یہ کتاب سب سے زیادہ دقیع اور قابل قدر خدمت ہے

اس عرصہ میں نگار کا مومن نمبر بھی شائع ہوا ہے ۔ جو دراصل پوری ایک کتاب ہے ۔ لیکن مومن کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہے ۔ مومن کو عام طور پر لوگ غالب کا حریف جانتے ہیں ۔ یا ہجر پردہ نشین میں مرنے والا اور کوچۂ رقیب میں سر کے بل جانے والا شاعر ۔ لیکن وہ غالباً پہلا غزل گو شاعر ہے ۔ جس نے انگریزی حکومت کے خلاف کھلم کھلا نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا ۔ اس کے کلام میں نہ ذوق کی سی خوشامد ہے اور نہ غالب کا سا ۔ "تاخدا با شد بہادر شاہ باد" والا انداز ۔ اور نہ انگریزوں کی چاپلوسی ۔ وہ انگریزی حکومت کے خلاف لڑ کر جان دینے کا خواہشمند ہے ۔ لکھتا ہے :-

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب　　یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں　　مری جاں فدا ہو تری راہ میں

اس زمانہ میں ہماری زندگی "خانوں" میں بٹی ہوئی تھی ۔ رندی و ہشیاری ایک ساتھ چلتی تھیں ۔ ان میں اتنا فرق نہ تھا جتنا کہ آج نظر آتا ہے ۔ زندگی عشق مجازی سے شروع ہوتی تھی ۔ اور بعض صورتوں میں وہ عشق حقیقی کا زینہ بن جاتی تھی ۔ مومن اپنے ماحول

سے متاثر ہوئے۔ لیکن اس سے اونچے بھی اٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں خودداری، انفرادیت اور آزادی کی تڑپ ہے۔ ان پہلوؤں پر زور دینے کی ضرورت تھی۔ مومن کی شاعری میں بھی یہی جدّت طرازی اور انفرادیت نمایاں ہے۔ مثلاً ؎

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں　　اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

یہ شعر ملاحظہ ہو :- ؎

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبّت کی زندگی　　ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

یہ تیور بھی دیکھئے :- ؎

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ　　بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

مومن کا فنی تجزیہ حضرت نیاز فتحپوری۔ سید اعجاز احمد مرزا جعفر علی خاں۔ اثر لکھنوی اور عبدالباری آسی نے بڑی محنت اور کاوش سے کیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مومن کے متعلق اس سے بہتر مجموعہ موجود نہیں ہے۔

اِس عرصہ میں دہلی کتاب گھر دہلی سے ایک کتاب "جنوبی ہند میں دو ہفتہ" شائع ہوئی ہے۔ اس کے لکھنے والے حضرت جگن ناتھ آزاد ہیں۔ ان کی شام جاں تک پہنچنے والی اور قلب کی تہوں میں بس جانے والی شاعری سے ہر اہل ذوق واقف ہے۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ نثر میں یہ ان کی پہلی کتاب ہے۔ جو منظر عام پر آئی ہے۔ اس کو بعض لوگ سفرنامہ بعض رپورتاژ کہتے ہیں۔ لیکن شاعرانہ زبان میں اس کا صرف ایک ہی نام ہو سکتا ہے۔

"افسانۂ آں شبے کہ با یار گزشت"

اسی لئے اس میں وہ لطف ہے جو "غزل" میں ہوتا ہے۔ ضمناً انہوں نے دکن کے متحدہ کلچر۔ پاکیزہ تمدن۔ اور زبان کے مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ دکن میں علاقائی باتوں کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ اور اس پر حکومت ہند ایک رپورٹ بھی مرتب کر چکی ہے۔ آزاد صاحب نے اس مسئلہ کے بھی بعض گوشوں کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور جو کچھ لکھا ہے

وہ سنجیدگی اور متانت کے ساتھ۔

اِس زمانہ کی ایک اور قابل ذکر کتاب سید ریاست علی ندوی کی ہے جس میں انہوں نے عہد وسطیٰ کے ہندوستان سے بحث کی ہے۔ یہ تاریخ کی کتاب ہے۔ اور اس کی طبع واشاعت کے لئے اُتر پردیش کی حکومت نے ڈیڑھ ہزار روپیہ دیا تھا۔ انہوں نے تاریخ کے بعض ایسے گوشوں پر بھی نظر ڈالی ہے۔ جو ابھی تک سب کی نظروں کے سامنے نہیں آئے عام تاریخوں میں عہد وسطیٰ محمدؐ بن قاسم کے اچانک حملہ کو دکھا کر غزنوی کے حملے سے شروع کیا جاتا ہے۔ فاضل مولف نے یہ بتایا ہے۔ کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت سے بہت پہلے لنکا۔ مال دیپ۔ مالابار۔ ٹراونکور۔ کارومنڈل۔ گجرات۔ بمبئی۔ سندھ۔ کشمیر۔ سرحد۔ بنگال اور بہار میں مسلمانوں کی نوآبادیاں قائم تھیں۔ اور یہاں کے ہندو راجاؤں اور باشندوں نے ان کو پوری رعائتیں دیں تھیں۔ اور وہ کامل آزادی کے ساتھ یہاں رہتے سہتے تھے اس میل جول کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونو کو ایک دوسرے کے تہذیب و تمدن علم و فن کے جاننے کا موقع ملا۔ عربوں نے ہندوستان کے قدیم علوم ہیت و نجوم۔ جوتش۔ حساب۔ ادب۔ شعر اور فن بت تراشی میں ہندوستان کی عظمت کو مانا۔ اور ان علوم کو عربی میں منتقل کر کے یورپ میں پھیلایا۔ اسی طرح طبی نظریے۔ جانوروں کے علاج کے طریقے۔ سانپوں کا علم جفر۔ رمل کیمیا۔ منطق۔ اخلاق۔ حکمت۔ موسیقی کے راگ، راگنیاں۔ غرض یہ سارے علوم و فنون عربی میں داخل کئے گئے۔ اور عرب و ہند کا رشتہ مستحکم ہوا۔ یہ ملی جلی آبادیاں اور یہ مراسم اور تعلقات باقاعدہ حکومت کے قیام سے بہت پہلے کے ہیں۔ بعد میں یہ اتحاد اور بڑھ گیا۔ جو آج بھی زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آ سکتا ہے۔

فاضل مولف نے اس تاریخ کے مرتب کرنے میں قدیم عربی اور فارسی ماخذوں کو استعمال کیا ہے اور اس طرح یہ ہندوستان کی تاریخ کی معیاری کتابوں میں ایک مفید اضافہ ہے۔ افسوس یہ کتاب مربوط نہیں ہے۔ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ لیکن پھر بھی

اس کا مطالعہ ان تمام لوگوں کے لئے ضروری ہے جو ہندوستان کے گذشتہ موجودہ اور آئندہ تمدن کے مسئلہ پر غور کر رہے ہیں۔

اس سہ ماہی کے ادب میں کمزوریاں اور خامیاں ہیں لیکن اس میں تعمیر عمل اور سنجیدگی بھی ہے، اس میں ایک بیدار روح اور نئے نئے مقاصد کی گرمی ہے اور یہی مستقبل کے لئے فال نیک ہے۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی)

اخلاق و فلسفۂ اخلاق

مکمل اور جدید ایڈیشن

علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب، جس میں تمام قدیم و جدید نظریوں کو سامنے رکھ کر اصول اخلاق، فلسفۂ اخلاق اور انواعِ اخلاق پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور اس کے لئے ایک مخصوص اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے، اسی کے ساتھ اسلام کے نظامِ اخلاق کی تفصیلات کو ایسی دل پذیر ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے مجموعۂ اخلاق کی فضیلت تمام ملتوں کے اخلاقی نظاموں کے مقابلے میں روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

فی الحقیقت ہماری زبان میں اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جس میں ایک طرف علمی اعتبار سے اخلاق کے تمام گوشوں پر مکمل بحث ہو اور دوسری طرف ابوابِ اخلاق کی تشریح علمی نقطۂ نظر سے اس طرح کی گئی ہو کہ اس سے اسلام کے مجموعۂ اخلاق کی برتری دوسری ملتوں کے ضابطہائے اخلاق پر ثابت ہو جائے اس کتاب سے یہ کمی پوری ہو گئی ہے اور اس موضوع پر ایک معیاری کتاب سامنے آگئی ہے اس ایڈیشن میں بہت کچھ حک و فک کیا گیا ہے اور متعدد مباحث کو نئے سرے سے مرتب کیا گیا ہے، حجم بھی پہلے سے کافی بڑھ گیا ہے صفحات ۵۹۲ بڑی تقطیع قیمت غیر مجلد چھ روپے آٹھ آنے بیس مجلد سات روپے آٹھ آنے معہ